خطبۂ افتتاحیہ

آل انڈیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کنونشن

منعقدہ دہلی ۱۰/۱۱ مارچ ۱۹۷۳ء

از

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی

شائع کردہ

مجلس استقبالیہ آل انڈیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کنونشن دہلی

www.abulhasanalinadwi.org

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرات!

آپ نے آل انڈیا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کنونشن کے افتتاح کا موقعہ عنایت فرماکر مجھے ایک عزت بخشی ہے، جس کے لئے میں آپ کا شکر گذار ہوں، ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں اس عظیم دانشگاہ نے جو اہم تعلیمی، سیاسی، علمی اور فکری کردار ادا کیا ہے اور ملت ہندیہ اسلامیہ کو جو ان نازک ترین حالات و مسائل سے دوچار تھی، جن سے ملت اسلامی کی کوئی دوسری برادری، اور وسیع دنیائے اسلام کا کوئی دوسرا حصہ دوچار نہ تھا، لائق رہنما کارکن، ادیب، خطیب، شاعر، منتظم اور غیور و جری سپاہی مہیا کئے جن کی کوئی مثال دنیائے اسلام کے کسی اور جدید تعلیم کی دانشگاہ کی تاریخ میں نہیں ملتی، اس کے فرزندوں نے تقریباً ایک صدی تک علم و تہذیب، اور سیاست و عمل کے جس وسیع ترین محاذ پر اپنی جد و جہد جاری رکھی، اسکی مثال بھی کسی دوسرے اسلامی ملک میں ملنی مشکل ہے، اس لئے ایک ایسی مجلس اور مذاکرہ کے آغاز کا نازک فرض انجام دینا ایک ایسے فرد کے لئے یقیناً عزت کی بات ہے جس کو ایک دن بھی اس موقر اور نامور درسگاہ میں تعلیم حاصل کرنے کی عزت حاصل نہیں ہوئی، آپنے اس انتخاب سے جہاں اپنی فراخدلی، اور وسیع النظری کا ثبوت دیا ہے، وہاں اس کا بھی عملی ثبوت فراہم کر دیا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ نے ہندوستان کے ہر حلقہ اور ملت اسلامیہ کے ہر طبقہ کو متاثر اور متفکر بنا دیا ہے، گویا اسی دہلی کے

www.abulhasanalinadwi.org

نامور استاد شاعر مرزا محمد رفیع سوداؔ نے اسی موقعہ کے لئے کہا تھا ؎

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانہ میں
تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانہ میں

اس موقعہ پر مجھے بے اختیار یہ واقعہ یاد آجاتا ہے، کہ جب ۱۹۲۰ء میں ہندوستان سے آپ کی اسی دانشگاہ کے لائق اور نامور فرزند رئیس الاحرار مولانا محمد علی کی قیادت میں مسلمانانِ ہند کا ایک وفد لندن جانا تجویز ہوا، تاکہ وہ حکومت برطانیہ کے ذمہ داروں کے سامنے خلافت کے بارے میں مسلمانانِ ہند کے خیالات و جذبات کی ترجمانی کرے، تو مولانا محمد علی نے اس وفد کی شرکت و رفاقت، اور مسلمانوں کے دینی نقطۂ نظر کی وضاحت کے لئے اسوقت کے ایک ممتاز عالم دین مولانا سید سلیمان ندوی کا انتخاب کیا، اس وفد کے ارکان جن مختلف حلقوں سے انتخاب کئے گئے تھے، اور ان کی ثقافت و لباس میں جو رنگا رنگی تھی، اسکی طرف حکومت کے ایک ذمہ دار نے اشارہ کرتے ہوئے کہا، کہ معلوم ہوتا ہے کہ "ہندوستان میں کسی چیز میں اتحاد نہیں پایا جاتا، اور وہ مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں کا ایک بوقلموں مرقع ہے"۔ مولانا محمد علی نے جن کی حاضر دماغی، اور حاضر جوابی شہرۂ آفاق ہے، اس کا برجستہ جواب دیا، کہ "یہی اس بات کی دلیل ہے کہ مسئلہ خلافت نے ہر مکتب خیال، اور ہر حلقہ اور طبقہ کو ایک نقطۂ نظر پر متحد اور جمع کر دیا ہے، اور یہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے دل کی آواز ہے"۔ اس کو حسن اتفاق کہئے، یا سوء اتفاق کہ لندن کی بیگانہ سرزمین پر نہیں، بلکہ دہلی کی عزیز اور آشنا سرزمین پر تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے، اور ہندوستان کے مختلف حلقوں کے نمائندے، اور قدیم و جدید نظام کے ساختہ پرداختہ ایک جگہ جمع ہو رہے ہیں، تاکہ اس مسئلہ میں جو بہت سی حیثیتوں سے مسلمانوں کی آئندہ

تعلیم و تہذیب، اور ان کے مستقبل کی تشکیل میں ایک فیصلہ کن حیثیت رکھتا ہے، اپنے اصلی خیالات، اور دلی جذبات کا اظہار کر سکیں۔

حضرات!

میں اس مختصر وقت اور فرصت میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ، اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (M.A.O. COLLEGE) کے قیام اور تاسیس کی تاریخ بیان کرنے میں آپ کا قیمتی وقت صرف نہیں کروں گا، نہ اُس پس منظر کا ذکر کروں گا جس میں یہ جدید تعلیمی مرکز قائم ہوا، نہ ان مشکلات اور نامساعد حالات کا تذکرہ کرونگا جن میں یہ تحریک شروع کی گئی نہ اس حقیقت کی توضیح پر آپ کا قیمتی وقت ضائع کرونگا کہ وہ مسلمانانِ ہند کی امنگوں، اور تمناؤں کی تکمیل کا بہترین ذریعہ اور انکی ذہانتوں اور صلاحیتوں کے اظہار کا نصف صدی سے زائد مدت تک سب سے بڑا میدان رہا ہے، نہ اسکا ذکر کرونگا کہ وہ بہت سے وجوہ سے جن میں بحث و نظر کی بڑی گنجائش ہے، ہندوستانی مسلمانوں کا سب سے قیمتی ملّی اثاثہ، اور انکی عظمتِ قومی کا نشان بن گیا ہے کہ یہ سب حقیقتیں کم سے کم اس تعلیم یافتہ مجمع اور اس دانشگاہ کے ابنائے قدیم اور جان نثاروں کے یہاں معروف و مسلّم ہیں، اور وہ نہ صرف ان سے آشنا بلکہ ان کے داعی اور مبلغ ہیں۔

میں یہاں صرف اس حقیقت کا اظہار کرتا ہوں کہ ایک آزاد مسلم یونیورسٹی کا قائم کرنا ابتدا سے اسکے بلند نظر اور عالی ہمت بانی کا نصب العین تھا، سرسید کا خیال تھا کہ جبتک مسلمانوں کی تعلیم گورنمنٹ کی مداخلت سے کلیۃً آزاد، اور خود مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ ہوگی مسلمانوں کو پورا فائدہ نہ پہونچے گا، ۱۸۷۳ء میں سرسید کے نامور فرزند سید محمود مرحوم نے مسلمانوں کی تعلیم کے

www.abulhasanalinadwi.org

متعلق جو اسکیم شائع کی تھی، وہ سرسید کے خیالات کا آئینہ ہے، انھوں نے ایک ایسی اسلامی یونیورسٹی کا نصب العین پیش کیا جو کیمبرج اور آکسفورڈ کی طرح حکومتِ وقت کے اختیارات سے آزاد ہو، سرسید کی وفات کے بعد ان کے رفقاء کا بھی یہی نصب العین رہا، چنانچہ ان کی وفات کے چند ماہ بعد دسمبر ۱۸۹۸ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس جو لاہور میں منعقد ہوا، اس میں محمڈن یونیورسٹی کی ضرورت پر زبردست تقریریں ہوئیں، اور اس کی تائید میں ریزولیشن پاس کیا گیا۔[1]

جن لوگوں کو سرسید اور ان کے رفقاء کے حقیقی خیالات، اور مقاصد کا علم ہے وہ جانتے ہیں کہ سرسید کے ذہن میں جدید تعلیم کی اشاعت اور مسلمانوں کی ایک نئی تعلیم یافتہ نسل کے پیدا کرنے سے زیادہ (جو چھوٹی بڑی اسامیوں پر فائز ہو) مسلمانوں سے احساس کہتری کا دور کرنا، ان کو اس شکست کے بدترین نفسیاتی، اور اخلاقی اثرات سے بچانا جو ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان کو اٹھانی پڑی تھی، ان کے اندر وہ ملہ مندی اور خود اعتمادی پیدا کرنا، اور ان کو اپنی مخفی یا مجہول، ذہنی و انتظامی صلاحیتوں سے آشنا کرنا تھا، جن کی مدد سے انھوں نے آٹھ سو برس تک اس ملک میں حکومت کی اور جدید ہندوستان کی تعمیر کا فرض انجام دیا، اور وہ تعلیمی و تعمیری شاہکار یادگار چھوڑے جن کے اجاگر اور روشن کرنے کے لئے سرسید نے "آثار الصنادید" جیسی کتاب لکھی، جو ان کی اگر سب سے بہتر تصنیف نہیں تو بہترین تصانیف میں ضرور ہے، جنھوں نے ان کے "تہذیب الاخلاق" کے مضامین اور ان کی کتاب "اسباب بغاوت ہند" پڑھی ہے، وہ اسی خیال کی تائید کریں گے کہ سرسید کا مقصد ایک ایسے تعلیمی مرکز کے قیام سے

[1] ملاحظہ ہو "حالات جاوید" "وقار حیات" اور "حیات شبلی"۔

بلند تھا، جس کا کام طوطے کی طرح پڑھا دینا، اور اقبال کی زبان میں "بلبل وطاؤس کی تقلید" کا سبق دینا تھا، ان کا قلعۂ معلیٰ سے قریبی تعلق رہا تھا، انھوں نے مسلمانوں کے اقتدار کے "چراغ کشتہ" کی آخری بھڑک دیکھی تھی، وہ اپنی اس "زمانہ شناسی" کے باوجود (جس میں وہ بدنامی کی حد تک نام آور ہیں) ملی غیرت، اور قومی حمیت کے اس جوہر سے مالا مال تھے، جو شاید اس وقت کے بڑے بڑے قوم پرست اور ترقی پسند رہنما کے اندر نہ پایا جاتا ہو، انھوں نے انگلستان کے طویل قیام میں اس حقیقت کا بڑے غور سے مطالعہ کیا تھا، کہ کیمبرج اور آکسفورڈ کی آزاد درسگاہوں نے برطانوی قوم کی زندگی اور اخلاق پر کتنا گہرا اثر ڈالا ہے، ان کے فضلاء نے کیسے نازک وقتوں میں قوم اور اس کے معاشرہ کی مدد کی ہے، اور اس جمہوری روح اور ذہن کو جو انگریز قوم کا طرۂ امتیاز اور اس کے عالمگیر اقتدار کا راز رہا ہے، اور جس کی بدولت وہ دو دو عظیم جنگوں سے زندہ اور طاقتور ہو کر نکلی، کس کس طرح سے بچایا ہے، انھوں نے ایک تعلیمی مبصر اور ذہین انسان کی طرح ان تعلیم گاہوں، اور حکومت کے تعلقات کی نوعیت پر بھی غور کیا ہوگا، جو صدیوں سے چلے آرہے تھے، اور ان جامعات کی ایک مقدس روایت، اور انگریزوں کا سرمایۂ افتخار بن گیا تھا، انگریزی زبان سے ناآشنا ہونے اور سن رسیدگی کی وجہ سے اس حقیقت کے ادراک میں ان کو جو دقت پیش آئی ہوگی، اس کو ان کے ذہین اور لائق فرزند سید محمود نے پورا کر دیا ہوگا، جن کو ان درسگاہوں کا عملی تجربہ تھا، اور جنھوں نے طالب علم بن کر اس آزادی اور تعلیم گاہوں کی خود مختاری، اور ان کے عزت و وقار کا نہ صرف مشاہدہ، بلکہ تجربہ بھی کیا، اور اس کی لذت سے وہ اس طرح شاد کام ہوئے کہ ہندوستان کے غلام اور

www.abulhasanalinadwi.org

محکوم ماحول میں آکر بھی وہ اسکو فراموش نہ کرسکے، انھوں نے ۱۸۷۳ء میں مسلمانوں کی تعلیم سے متعلق جو اسکیم شائع کی تھی، اس میں ایک جگہ لکھتے ہیں، کہ:-

"جب تک کہ ہم ایسی حاجتوں کی نسبت بھی جو ہماری ذاتی باتوں سے متعلق ہیں (جیسی کہ تعلیم ہے) گورنمنٹ پر بھروسہ کریں گے، تو درحقیقت اس شے کے حاصل کرنے کی توقع کرتے ہیں، جس کا حاصل کرنا بالکل ناممکن ہے، سب سے عمدہ مدارس تعلیم علوم کے یوروپ میں بالکلیہ یا قریب اس کے اس ملک کی گورنمنٹ کی مداخلت اور انتظام سے علیحدہ ہیں"[1]

لیکن اس آزاد یونیورسٹی کا تخیل جس کا نظم ونسق واضح طریقہ پر مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو، ایک خواب بے تعبیر بنا رہا، ۱۹۱۰ء میں بعض سیاسی اسباب کی بناء پر ہز ہائینس سر آغا خاں نے اس تحریک کی قیادت اپنے ہاتھ میں لی، اور مسلمانوں کی خفتہ تمنائیں بیدار ہوگئیں، پورے ملک میں اس کی ایک عام تحریک شروع ہوئی، سرسید کے رفقاء قدیم نواب وقار الملک وغیرہ نے اسکی پوری تائید کی، شہر شہر جلسے ہوئے، یونیورسٹی کی تحریک کا وفد سر آغا خاں کی قیادت میں دروازہ دروازہ گیا، اس تحریک میں مسلمانوں کے لئے جو کشش پائی جاتی تھی اور اس میں ان کو اپنی قومی امنگ کی تکمیل کا جو سامان نظر آتا تھا، اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ اس یونیورسٹی کے قیام کے لئے تھوڑے دنوں میں اکتیس لاکھ کی مطلوبہ رقم جمع ہوگئی، آپ اگر اس وقت کے حالات، اور اس رقم کی قوت خرید اور

[1] "وقار حیات" ص ۵۶۱

افادیت کا صحیح اندازہ کریں تو یہ رقم آپ کو کروروں کی معلوم ہوگی۔

اس تحریک میں بھی کالج کے حقیقی بہی خواہوں، اور سرسید کے صحیح جانشینوں نے اس پہلو کو کبھی نظر انداز نہیں کیا، کہ یہ یونیورسٹی حقیقی معنی میں مسلمانوں کے انتظام اور اثر میں ہوگی، اور اس پر ان کا اقتدار اعلیٰ قائم ہوگا، انھیں کے نمائندے جو آزادانہ، اور جمہوری اصولوں کے مطابق منتخب کئے جائیں گے، اس یونیورسٹی کے نظم ونسق پر حاوی، اور اس کے لئے مسلمانوں کے سامنے جوابدہ، اور ذمہ دار قرار پائیں گے، ان کو صرف اسی صورت میں یونیورسٹی کا قیام منظور تھا، اور وہ اس کے لئے اس جدوجہد اور قربانی کو حق بجانب سمجھتے تھے، جو اس کے قائم کرنے کے لئے دی جارہی تھی، جب مجوزہ یونیورسٹی کا کانسٹی ٹیوشن مرتب کرکے ۹ اگست ۱۹۱۱ء کو شائع کیا گیا، تو ہندی مسلمانوں کے سب سے بڑے با اصول وصاحب ضمیر رہنما، اور علی گڑھ تحریک کے سب سے زیادہ دیانتدار اور جری قائد نواب وقار الملک مرحوم آنریری سکریٹری M.A.O. کالج نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے قوم کے سامنے ایک یادداشت پیش کی، اس میں ایک ٹکڑا یہ بھی تھا کہ:-

"اعلیٰ حکمراں جماعت جس طرح اب تک کالج میں صرف مسلمانوں سے مرکب ہے، اسی طرح آئندہ بھی یہ اعلیٰ حکمرانی صرف مسلمان ٹرسٹیوں کے ہاتھ میں رہنے کے واسطے مسودہ میں تجویز کی گئی ہے، اور جس قدر اس وقت مسلمان ٹرسٹی کالج میں ہیں، وہ سب کے سب بطور کورٹ آف ٹرسٹیز کے یونیورسٹی کی اعلیٰ جماعت حکمراں متصور ہوں گے۔

www.abulhasanalinadwi.org

جس طرح اس وقت ٹرسٹیوں کا سنڈیکیٹ صرف مسلمان ٹرسٹیوں سے مرکب ہے، اسی طرح آئندہ یونیورسٹی میں بھی وہ جماعت از نام "کونسل"، کورٹ آف ٹرسٹیز کے ماتحت بطور ایک کارپرداز جماعت کے صرف ٹرسٹیز (یعنی مسلمان ممبروں) سے مرکب ہوگی۔"[1]

پھر جب ۲ر۳ر۴ر جون ۱۹۱۲ء کو کانسٹی ٹیوشن کمیٹی کا چوتھا جلسہ مسودۂ قانون پر غور کرنے کے لئے لکھنؤ میں منعقد ہونے والا تھا، اور اس مسودہ میں بہت کچھ ترمیمیں ہوگئی تھیں، تو نواب صاحب مرحوم نے اپنی علالت اور معذوری کے باوجود قوم کو آگاہی دی، انھوں نے تحریر فرمایا کہ:۔

"اس (ترمیم شدہ) مسودۂ قانون پر جہاں تک مجھ کو غور کرنے کا موقعہ ملا ہے، وہ بہت زیادہ اصلاح کا محتاج ہے، اور جو کچھ اس میں اس وقت درج ہے، اگر بدقسمتی سے وہی اخیر وقت تک قائم رہ جائے، تو میں صاف یہ رائے دوں گا کہ ایسی یونیورسٹی کو ہمیں دور ہی سے سلام کرنا چاہئے جس کے ریگولیشنز کے ذریعہ ہم اپنی اس آزادی کو بھی کھو بیٹھیں گے، جو آج ہم کو علی گڑھ کالج کی موجودہ حالت، اور موجودہ قانون کے بموجب حاصل ہے۔"[2]

مسلمانوں کے اسی جذبہ کی کہ یونیورسٹی کا نظم ونسق، اور اقتدار اعلیٰ مسلمانوں کے ہاتھ میں ہوگا، سب سے بہتر ترجمانی علامہ شبلی نعمانی نے اپنے ایک شعر میں کی، جو ان کی اسی مشہور نظم کا مطلع ہے، جو انھوں نے لاہور کے جلسۂ استقبالیہ میں پڑھی تھی، وہ فرماتے ہیں کہ ؎

۱؎ "وقار حیات" ص۵۷۳ ۲؎ ایضاً، ص۵۷۹

ہمیں یک حرف از یونیورسٹی مدعا باشد
کہ ایں سررشتۂ تعلیم ما در دستِ ما باشد

اس سے بہتر اور بلیغ تعبیر اس حقیقت کی نہیں ہوسکتی، کہ جن کی تعلیم کا یہ سررشتہ ہے، انھیں کے ہاتھ میں رہے، اور وہ اس کو اپنی ضرورت کے مطابق پھیلا اور سمیٹ سکیں، اسی وقت وہ اس کی پوری گرمجوشی کے ساتھ حفاظت کریں گے، اور اس کو اپنے سینہ سے لگائے رکھیں گے۔

حضرات!

یونیورسٹی کے قیام اور تاسیس کی کہانی بہت طویل ہے، اور تلخ و شیریں حقائق، رزم وبزم کے مناظر، اور قانونی ودستوری معرکہ آرائیوں کے واقعات سے بھری ہوئی، وہ اب ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا ایک ضروری باب بن گیا ہے، جس کو مسلم یونیورسٹی کی تاریخ میں (جو افسوس ہے کہ ابھی تک مناسب طریقہ پر نہیں لکھی گئی) اور "الہلال" کے فائیلوں میں پڑھا جاسکتا ہے، اس کو یہاں نہ دہرانے کی گنجائش ہے اور نہ آپ کو اس کی ضرورت، مختصر یہ ہے کہ اس تحریک کے علمبرداروں کی کوشش سے جن میں مہاراجہ محمود آباد، سر علی محمد خاں پیش پیش تھے، ۱۹۲۰ء میں مسلمانوں کو یونیورسٹی کا چارٹر مل گیا، اس کا جو قانون (کانسٹی ٹیوشن) منظور کیا گیا، اس میں اگرچہ بزرگوں میں نواب وقار الملک، اور نوجوانوں میں مولانا ابوالکلام آزاد کی خواہش اور معیار کے مطابق مسلمانوں کو وہ اختیارات، اور تحفظات نہیں دیئے گئے جن کا مطالبہ کیا گیا تھا، لیکن اس قائم ہونے والی یونیورسٹی پر انتظامی اقتدار اعلیٰ

www.abulhasanalinadwi.org

مسلم یونیورسٹی کورٹ کا تسلیم کیا گیا، جس کے ممبران مسلمانوں کی مختلف جماعتوں تنظیموں مکاتب خیال، معاونین، ہمدردوں اور خود یونیورسٹی کے عملہ سے منتخب ہو کر آتے تھے، یونیورسٹی میں ایکیڈیمک کونسل، اور ایگزیکٹیو کونسل کے نام کی دو جماعتوں کی موجودگی کے باوجود آخری فیصلہ یونیورسٹی کورٹ ہی کے ہاتھ میں تھا، وہی وائس چانسلر منتخب کرتی تھی، وائس چانسلر کے اختیارات بھی محدود تھے، اس طرح مسلمان ملت کی بالاتری، اور اس کا نفوذ و اثر اس یونیورسٹی میں موجود تھا، اور یہ ہندوستانی مسلمانوں کے لئے ایک بڑے اطمینان و اعتماد کا موجب تھا، جس کی وجہ سے وہ اپنے جگر گوشوں کو بڑی مسرت اور طمانیت کے ساتھ اس یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے لئے بھیجتے تھے، اس نیم خود مختارانہ ماحول میں ان کی صلاحیتیں اور توانائیاں نشو و نما پاتی تھیں، وہاں ان کے اندر جرأت، حوصلہ مندی، اور خود اعتمادی پیدا ہوتی تھی اور ان کی ذہانتیں، اور صلاحیتیں بغیر کسی رکاوٹ کے سیل رواں کی طرح ابھرتی اور ابلتی تھیں، اور زندگی کے ہر شعبہ کو شاداب اور سیراب کرتی تھیں، یونیورسٹی کا عوام اور ہندوستانی مسلمانوں کے ذہین اور باصلاحیت طبقہ سے براہ راست ربط تھا، اور اس کے ذریعہ سے اس کے درخت میں نمو اور شادابی، اور برگ و بار لانے کی صلاحیت پیدا ہوتی تھی، جو ایک آزاد قومی دانشگاہ کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

۱۹۴۷ء میں آزاد قومی حکومت کے قائم ہونے سے اس کی امید تھی، کہ اس یونیورسٹی کی وہ نیم خود مختارانہ حیثیت قائم رہے گی جو ۱۹۲۰ء کے ایکٹ نے اس کو عطا کی تھی، اس لئے کہ قومی حکومت کا سب سے بڑا انعام، اور اس کے قیام کا

سب سے بڑا فائدہ قومی امنگوں، اور آرزوؤں کی تکمیل، مختلف فرقوں اور اقلیتوں میں نہ صرف اپنی جان و مال، اور عزت و آبرو، بلکہ ان عقائد و مقاصد، اور تہذیب و ثقافت کے تحفظ کا بھی یقین ہے، جو ایک بامقصد اور صاحب ضمیر انسانی جماعت کو اکثر اوقات جان و مال اور عزت و آبرو سے زیادہ عزیز ہوتی ہے، اور یہی اس کے اور چیختے پاتو جانوروں کے درمیان (جنکی جان کی سلامتی اور راتب کا عام طور پر گھروں میں انتظام کیا جاتا ہے) خط فاصل ہے، یہ امید دستور کے اس دفعہ کی روشنی اور سایہ میں یقین کے درجہ تک پہونچ جاتی تھی کہ "ہر اقلیت اور فرقہ کو اپنی مرضی کے مطابق اپنی تعلیمی اور دوسرے قسم کے اداروں کو قائم کرنے، ان کا انتظام کرنے، اور ان کو جاری رکھنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی"۔

لیکن یہ امید غلط ثابت ہوئی، اور حکومت کی طرف سے پے در پے ایسے اقدامات کئے گئے، جن سے ایک بدیشی حکومت کے دیئے ہوئے حقوق بھی مجروح بلکہ سلب ہونے شروع ہو گئے، ۱۹۶۵ء کے یونیورسٹی ایکٹ کی ترمیم کے ذریعہ ایڈمنسٹریشن ایک نئی ایگزیکٹیو کونسل کے ہاتھ میں دیدیا گیا، جو نو اشخاص پر مشتمل تھی، جو سب حکومت کی طرف سے نامزد کئے گئے تھے، کورٹ ایکیڈیمک کونسل، اور پرانی ایگزیکٹیو کونسل معطل کر دی گئی، اور تمام اختیارات اسی نئی ایگزیکٹیو کونسل کو دیدیئے گئے، جس کو مرکزی حکومت کی نگرانی میں کام کرنا تھا، پھر یکم جون ۱۹۷۲ء کو لوک سبھا میں مسلم یونیورسٹی ترمیمی ایکٹ نہایت عجلت کے ساتھ پاس کر دیا گیا، اس ایکٹ کے مضمرات اور نتائج پر آپ بہت سے تبصرے اور مضامین پڑھ چکے ہیں، اور اس موقر مجلس میں ان پر پھر ناقدانہ تبصرہ، اور آزادانہ مذاکرہ ہوگا، خطبۂ صدارت بھی

www.abulhasanalinadwi.org

اس سلسلہ میں ہم کو رہنمائی اور روشنی دیگا، میں اس کی تفصیلات میں جانا نہیں چاہتا لیکن اتنا کہے بغیر گذر نہیں سکتا کہ اس ایکٹ کی رو سے جو مسلم یونیورسٹی کورٹ، ایگزیکٹیو کونسل اور جو اکیڈیمک کونسل بنتی ہے، اور ان کے ممبروں کے انتخاب کرنے کے اختیارات، اور صلاحیت جن جماعتوں اور افراد کو دی گئی ہے، اس کا تجزیہ کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ محض مرکزی حکومت، اور اس کی ایجوکیشن منسٹری کے منشا کو پورا کرنے والی فرمانبردار جماعتیں ہوں گی، ان میں مسلمانوں کی آزاد نمائندگی کا کوئی امکان باقی نہیں رہا، خود مسلم یونیورسٹی کورٹ محض ایک مشاورتی ادارہ بن کر رہ گئی ہے، جس کا کام صرف تبصرہ کرنا، اور وزیر کے سامنے اظہار خیال کر دینا ہے، وائس چانسلر جو منسٹری آف ایجوکیشن کا انتخاب کردہ ہوگا، عملاً یونیورسٹی کا مختار کل، اور ڈکٹیٹر ہوگا، جس کی مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں ہو سکتا، اس سب سے اگر یہ نتیجہ نکالا جائے، تو ہرگز قیاس آرائی، اور بدگمانی نہیں ہوگی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا ۱۹۷۲ء کا ترمیمی ایکٹ حکومت کی کلیت پسندی، کمیونسٹوں کی آرزوؤں کی تکمیل، اور یونیورسٹی پر حکومت کے ذریعے ان کے اقتدار کی ضمانت ہے۔

حضرات!

تاریخ جدید کا شاید سب سے بڑا سانحہ اور سیاست کی انسانیت کے حق میں سب سے بڑی زیادتی یہ ہے کہ ذہن و اخلاق کے سرچشمے، شخصیت و کردار کی کارگاہیں، اور زندگی کی رہنمائی کرنے والے مرکز، بے رحم اور بے ضمیر سیاسی مقاصد اور انتخابی مصالح کے تابع ہو جائیں، اور وہ ان کے مستقبل، اور ان کی

موت و حیات کے بارے میں فیصلہ کن بن جائیں، اس اصول کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی کہ قومی حکومت، غیر ملکی حکومت کے مقابلہ میں قومی زندگی، اور تعلیم و تربیت کے میدان میں رہنمائی کی زیادہ قابل اور اعتماد کی زیادہ مستحق ہے، اور اب حکومتوں کا دائرہ اختیار ٹیکس وصول کرنے، اور جان و مال کی حفاظت اور ملک کی دفاع تک محدود نہیں، میں یہ کہنے کی جرأت کروں گا کہ تعلیمی مرکزوں کو صنعتی کارخانوں، فیکٹریوں، اور ملوں پر قیاس کرنا، اور ان کو یکسر اپنے نظم و نسق میں لے لینا، ان کا رشتہ اس اقلیت، فرقہ یا جماعت سے کاٹ دینا جس نے ان کو قائم کیا، اور اپنے خون پسینہ سے ان کو پروان چڑھایا، ایک بڑا سنگین اقدام ہے۔ جس کے نتائج بڑے دوررس اور عمیق ہیں، کسی ملک میں ایک ہی طرح کے دل و دماغ کے ڈھالنے، ایک ہی طرح کی سیرتیں اور شخصیتیں پیدا کرنے اور ایک ہی طرح کے سیاسی خیالات و مقاصد رکھنے والوں کا گروہ وجود میں لانے کی کوشش، ملک اور معاشرہ کو ایک بڑے خطرہ سے دوچار کرنے کے مرادف ہے، یہ رویہ کسی شوفیکٹری اور کسی گن فیکٹری کے ساتھ تو مناسب ہے، لیکن دانشگاہوں، اور ذہنی تربیت کے مرکزوں کے ساتھ کسی طرح مناسب نہیں، تاریخ کی مسلسل شہادتیں ہیں کہ جب کسی وجہ سے کسی ملک اور معاشرہ پر کسی غلط فلسفہ یا رجحان کا تسلط، اور اس پر کسی اعصابی دورہ کا حملہ ہوا، اور وہ کسی بے راہ روی، بے اعتدالی یا کسی شدید اخلاقی، ذہنی، اور اجتماعی انتشار کا شکار ہوا، تو صرف دو مرکزوں سے اس کی چارہ سازی کا انتظام ہوا، انھوں نے اس سرسامی کیفیت کا مقابلہ کیا، بگڑے ہوئے حالات سے پنجہ آزمائی کی، اپنی جان، اور اپنے مستقبل کو خطرہ میں ڈال کر میدان میں

www.abulhasanalinadwi.org

آگئے، ان کی صدائے احتجاج اور مخالفت اگرچہ "نقارخانہ میں طوطی کی آواز" کے مرادف تھی، لیکن انھوں نے پوری بلند آہنگی، اور بے خوفی سے بلند کی، یہاں تک کہ وہ اپنا اثر کئے بغیر نہ رہ سکی، اور اس جان بلب ملک یا معاشرہ کو موت کے منہ سے نکال لیا یہ مذہب اور تعلیم کے دو مرکز ہیں، جنھوں نے ہمیشہ مریض قوموں کی دستگیری اور مسیحائی کی ہے، اور انھیں سے وہ مصلح، ریفارمر، اور انقلابی برآمد ہوئے ہیں، جنھوں نے ملک اور معاشرہ میں زندگی کی ایک نئی روح پیدا کردی ہے، اور ان کی کشتیٔ حیات کو ہمیشہ کے لئے غرق ہونے سے بچا لیا ہے، یونان اور روما، مشرق اور خود یوروپ کی پوری تاریخ اس کی گواہ ہے، یہ نازک وقت پوری سیاسی بیداری دفاعی قوت، اور تعلیم کی ترقی کے ساتھ ہر ملک اور قوم پر آسکتا ہے، اگر ہماری تعلیم گاہیں کلیۃً حکومت کے اختیار اور اقتدار میں آجائیں، وہاں ایک ہی طرح کا فلسفہ پڑھایا جانے لگے، ایک ہی طرح کے ماڈل تیار ہوں، ایک ہی سیاسی پارٹی اور اس کے مقاصد کا ان کو نقیب اور نقارچی بنا دیا جائے، وہاں کے اساتذہ اور تعلیمی منتظم سرکار دربار کے چشم وابرو کے اشارے کو دیکھنے والے ہوں تو پھر اس ملک کو تباہی سے بچایا نہیں جاسکتا۔

ایک کلیت پسند (TOTALITARIAN) حکومت جو درحقیقت خوف و اندیشہ، احساس کمتری، اور اپنے عوام کے ساتھ بدگمانی اور بے اعتمادی کے مرض میں گرفتار ہوتی ہے، اور جو ہر جوہر، ہر ذہانت، اور ہر جرأت و خود اعتمادی کو شک وشبہ کی نگاہ سے دیکھتی، اور اپنے مستقبل کے لئے خطرہ سمجھتی ہے، اکثر یہ خطرناک قدم اٹھاتی ہے، وہ صرف صنعتوں، تجارتوں، اور کمپنیوں کو نیشنلائز

نہیں کرتی، اور اپنے کنٹرول میں نہیں لیتی، بلکہ تعلیم گاہوں، علم و دانش کے مرکزوں تصنیفی اداروں، اور آخر میں ادب و شاعری، اور فنون لطیفہ (FINE ARTS) کو بھی اپنی نگرانی اور انتظام میں لینے کی کوشش کرتی ہے، اور ہر اس "مال" کو جعلی اور غیر قانونی قرار دیتی ہے جس پر اس کا ٹھپہ نہ لگا ہو، خواہ وہ افکار و خیالات ہوں، خواہ ادبی و علمی شاہکار، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس ملک کی زندگی، زندہ دلی، جدت اور اپج سے محروم، تنوع اور رنگارنگی سے خالی، اور جوش و خروش اور جذبۂ مسابقت سے عاری ہوجاتی ہے، تعلیم گاہیں، ایک لگے بندھے نظام کی غلام، اور لکیر کی فقیر بن کر رہ جاتی ہیں، وہاں سے ایسے فضلاء پیدا ہونے بند ہوجاتے ہیں، جو عام سطح سے بلند، اور غیر معمولی، اور جینیس کہلانے کے مستحق ہوں، بلند قامت اور دیوپیکر انسانوں کے بجائے ہر شعبۂ زندگی میں کوتاہ قامت اور بالشتئے (PYGMIES) پیدا ہونے شروع ہوجاتے ہیں، فلسفی اور مفکر، ادیب و شاعر یا تو کسی نئے خیال کا اظہار نہیں کرپاتے، یا ان کو اس کی سخت سزا بھگتنی پڑتی ہے یہی وجہ ہے کہ بائیں بازو کے کلیت پسند (LEFT-TOTALITARIAN) ممالک میں ادیبوں، شاعروں، افسانہ نویسوں، اور مفکروں کی خودکشی کے حوادث کثرت سے پیش آتے ہیں، ان حکومتوں نے مذہب اور تعلیم دونوں اداروں اور مرکزوں کو خاموش اور بے اثر بنا دیا ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ وہاں تنقید و احتساب اور دعوت فکر کے لئے ایک آواز بھی بلند نہیں ہوتی، اور وہاں موت کا سناٹا طاری ہے۔

ہمارے ملک میں کلیت پسندی کا رجحان پایا جانا، یونیورسٹی ایکٹس میں

www.abulhasanalinadwi.org

بار بار، اور تیزی کے ساتھ ترمیم کا ہونا دستور ہند (جو اقلیتوں کا آخری سہارا اور پناہ گاہ ہے) میں بڑی سے بڑی تبدیلی کا چٹکیوں میں ہوجانا ایک شدید خطرہ کی علامت، اور ایک بڑی تباہی کا پیش خیمہ ہے۔

مجھے آپ یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ مسلم یونیورسٹی کا مسئلہ جس کیلئے آپ جمع ہوئے ہیں، محض ایک یونیورسٹی کا مسئلہ نہیں ہے، یہ اس ملک میں ضمیر، عقیدہ و مسلک اور تعلیم و تربیت کی آزادی اور تحفظ کا مسئلہ ہے، ہم آپ اچانک چلتے چلتے ایک اہم اور فیصلہ کن دوراہے پر پہونچ گئے ہیں اور ہمارے سامنے سورج کی طرح روشن ایک سوالیہ نشان آکر کھڑا ہوگیا ہے، کیا اس ملک میں حقیقی جمہوریت پھلے پھولے گی، یا یہ ملک کلیت پسندی (TOTALITARIANISM) کی منزل کی طرف تیزی کے ساتھ جائے گا، اور اشتمالیت (کمیونزم) کو ایک مسلک اور فلسفۂ حیات، اور ایک آئین اور دستور کی طرح پورے طور پر قبول کرے گا؟ اس لئے درحقیقت آپ اس جلسہ سے صرف اپنی جماعت، اور اپنے ادارہ کی خدمت نہیں کر رہے ہیں، بلکہ پورے ملک کی خدمت کر رہے ہیں، اور اس طرح آپ تمام محبان وطن، جمہوریت پسندوں، ہندوستان کے سچے بہی خواہوں، اور تعلیم کی شرافت و عزت، اور اس کی خودداری اور غیرت پر عقیدہ رکھنے والوں کے شکریہ کے مستحق ہیں، میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے بروقت خطرہ کا احساس کیا، اور ایک اہم اور عظیم مقصد کے لئے آپ یہاں جمع ہوئے ہیں، میری دعا ہے کہ

خدا آپ کی صحیح رہنمائی فرمائے، اور آپ کی مدد کرے۔

ابوالحسن علی ندوی

دائرہ شاہ علم اللہؒ
رائے بریلی

۱۶ر محرم الحرام ۱۳۹۳ھ
۲۰ر فروری ۱۹۷۳ء

(نامی پریس لکھنؤ)

www.abulhasanalinadwi.org